

”میں ذرا کافی تک جا رہی ہوں۔“ وہ بولی: ”گذو کو یہاں چھوڑے جاتی ہوں۔“ وہ جھک کر پچے کے بال سیدھے کرتے ہوئے بولی: ”گذو جی، میں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتی ہوں۔ آپ انکل کے پاس ٹھریئے۔ اچھا؟“ اور اسے ماتھے پر چوم کر باہر نکل گئی۔

پیچھے گھر میں جب وہ سو کر اٹھا تو میز پر اس کا ناشتہ ڈھکا پڑا تھا اور کھڑکی کے راستے اتر آتی ہوئی دھوپ اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کلپی کی اور ناشتہ کیا۔ پھر وہ ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر سیدھا لیٹ گیا اور کمرے میں داخل ہوتی ہوئی دھوپ کی اس چوڑی سی شعاع کو دیکھنے لگا جس میں گرد کے ذرات معلق تھے۔ گرد کے ذرات والی دھوپ کی شعاعوں کو دیکھنا اس کا محبوب مشغله تھا۔ اس سے اسے بدن کے ہلکے پن کا احساس ہوتا تھا جس سے پھر اڑان کی یاد آتی تھی۔ سو کر اٹھنے کے بعد جو آسودگی کا مختصر سا وقت آتا تھا اس میں اس نے ناشتہ کیا تھا، اور کھانے کے بعد جو ایسا ہی تھوڑا سا وقت ملتا تھا اس میں وہ پھر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کروٹ لی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ دیوار میالے سے زرد رنگ کی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے پھر اس زرد روشن رنگ کو یاد کیا۔ اب اس رنگ کی ایک بو بھی تھی: تازہ شد کی سی، شیریں کے زرد باریک تاروں والے پھولوں کی سی، جو گرمیوں کی شاموں کو کسی سڑک پر چلتے چلتے اچانک ناک میں داخل ہوتی تھی اور پتا چلتا تھا کہ یہاں پاس ہی کسی شیریں کا پیڑ ہے، یا شاید ستحے کی خشک جڑوں کو پانی دیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ یا کہ صرف ماضی ہے!

پرانے آبائی شر میں اس کی اوپنچے اوپنچے دلبے پتلے سرو کے پودوں اور گھاس کے وسیع و عریض قطعوں والی یونیورسٹی تھی جس کی پرانی پرانی کائی جمی،

عشق پیچاں کی بیلوں سے لدی عمارتیں تھیں جن کے موٹے موٹے چوکور ستونوں والے برآمدے تھے اور چوڑے چوڑے، پھر کی سیڑھیوں والے زینے تھے اور اونچی اونچی چھتوں والے کمرے تھے اور ہر عمارت کا اپنا ایک مینار تھا جس کے اندر بل کھاتا ہوا تنگ سازیں چڑھتا تھا جو اوپر برجی میں جا کر نکلتا تھا جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ پھر جب اس روز فتحہ ایر کیمپری کے اس کھوئی کھوئی آنکھوں والے خوبصورت سے طالب علم نے ایک دروازہ توڑ کر برجی سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی تو ساری برجیوں کے دروازوں پر پلستر کروادیا گیا تھا اور اس نے یونیورسٹی میگزین میں اس موضوع پر ایک کہانی لکھی تھی جس کا برا چرچا ہوا تھا اور اسی واقعے پر اس نے یونیورسٹی کے نامہ نگار کی حیثیت سے شرکے سب سے بڑے اخبار میں ایک زبردست مضمون لکھا تھا جس نے اس کی دھاک بٹھا دی تھی۔ وہ یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ وہ ڈی بنینگ ٹائم کا لیڈر تھا۔ وہ شعلہ بیان مقرر تھا۔ وہ چوٹی کا طالب علم تھا۔ وہ یہاں، وہاں تھا اور ہر جگہ تھا۔ اس کی کہانیوں کی ایک دھوم تھی۔ اس کی اور ریاض کی جوڑی یونیورسٹی بھر کی نظریوں میں تھی۔ ریاض اول نمبر کا اتحلیث، ہاکی ٹائم کا نائب کپتان اور چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔ اس کی بڑی خوش دل، ہنس لکھ اور لاپرواہ شخصیت تھی۔ ذاتی مقبولیت میں ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود دونوں کا آپس میں گرا یارانہ تھا۔ ریاض کا باپ ایک انگریزی روزنامے کا مالک تھا اور اس نے شوکت کو اپنے اخبار کی پارت نامہ نگاری دے دی تھی کیونکہ اس کو پڑھائی کے لئے اخراجات کی ضرورت تھی۔ ریاض ہاکی اور دوڑ کی پریکش کے بعد شام کو اس کے گھر آ جاتا اور پھر دونوں سائیکلوں پر سوار خبروں کی تلاش میں شر بھر میں پھرا کرتے اور اجنبی لڑکیوں کا تعاقب کرتے (جان پیچاں والی لڑکیوں کے تو وہ ہیرو تھے چنانچہ لیئے دیئے رہتے) ان

دنوں اس کے دو مستقل ٹھکانے تھے: ایک اپنا گھر اور ایک ریاض کا گھر۔ ریاض کے گھر میں اس کی حیثیت کنبے کے ایک فرد کی سی تھی۔ وہ ریاض کی ماں سے بالکل بچوں کی طرح ضد کرتا اور اس کی چھوٹی بہنوں پر بڑے بھائیوں کی طرح رعب گا نہ تھا۔ اکثر وہ رات کا کھانا ان کے گھر پر کھاتا اور بعد میں دیر تک ڈائنگ نیبل پر بیٹھا ریاض کے باپ کے ساتھ سیاسی معاملات پر پر جوش بحشیں کیا کرتا۔ ریاض بیٹھا اوپنگتا رہتا اور بعد میں اس کی پشت پر دھپڑ مار کر کرتا: ”عجائب بور آدمی ہو یا۔ جانتے نہیں ابا جان کا بلڈ پریشر پملے ہی ہائی ہے۔“ جس روز ریاض نے یونیورسٹی سپورٹس میں چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ توڑا اس نے تین روز لگا کر ایک نوٹ لکھا تھا جو میگزین میں ریاض کی تصویر کے نیچے چھپا اور جس کا شکریہ ادا کرتے کرتے ریاض تقریباً روپڑا تھا۔ پھر اس کے صلے کے طور پر ریاض نے انٹرو رشی ڈی بیٹ میں اس کی تقریر کے دوران ہوٹنگ بند کرانے کے لئے آدھے ہال سے لڑائی مول لی تھی۔ یہ نوجوانی کا وہ سنرا زرد اور ہلکا سبز زمانہ تھا جب دل میں زور ہوتا ہے اور نگاہوں میں عزم ہوتا ہے اور آدمی دنیا کی سب سے اوپنجی چھوٹی پر بیٹھا جیسے ہر وقت اڑنے کے لئے پرتوں رہا ہوتا ہے۔ جب چھوٹی سے چھوٹی بات بھی — رات کے نانے میں گم ہوتا ہوا کوئی الوداعی قہقہہ، کمر پر پڑتا ہوا پیار بھرا دھپ، ذہنوں کی وہ مخصوص بے تار برتنی اور آنکھوں کی وہ مخصوص لمحاتی چمک (جیسے خاموش بیٹھے بیٹھے اچانک ایک ساتھ ایک ہی بات کو یاد کر کے چونک پڑنا اور پھر نظرؤں کا ملن اور بالکل ناقابل تشریح طور پر ایکدوسرے کے دل کی بات کو جان لینا اور اطمینان سے خاموش بیٹھے رہنا)، یا باہر برآمدے میں کسی کے مانوس قدموں کی چاپ (جیسے گرمیوں کی لمبی لمبی سہ پھروں میں اکیلے بیٹھے بیٹھے کسی کو یاد کرنا اور دل میں اس کے ملنے کی خواہش کرنا اور اسی وقت بالکل انجانے طور پر اس کا وہاں پہ آنکھنا)، یا اپنے

پرائیویٹ مذاق (جن کے حوالے سے بھری مجلس میں آپ ہی آپ میں محظوظ ہوتا)۔ وہ زمانہ جب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی گھری رفاقت کا احساس دلاتی ہیں اور جب صرف دو ایک پسند کے دوست مل جانے پر ہی آدمی کے دل کے سارے جذبے پورے ہو جاتے ہیں اور ہوس کا دور دور تک نشان نہیں ہوتا اور دل شکنی ابھی دل سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنی دنیا میں بڑے مکمل اور بہت خوش تھے۔

پھر، ستری ڈیپارٹمنٹ میں وہ لڑکی آکر داخل ہوئی۔ وہ دونوں آخری سال میں تھے کہ فتحہ ایئر، ستری میں جمال افروز انصاری آکر داخل ہوئی جسے سب لوگ پیار سے جال کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ سبز ساری پہنتی تھی (سینڈریٹ قسم کے لڑکوں نے اس کا نام سبز پری رکھ چھوڑا تھا) اور بات کرتے کرتے جب ذرا جوش میں آ جاتی تو اپنی بھوری پلکوں کو سکیٹر کر بڑے جلال سے بات کرتی تھی۔ اس کا یہی انداز تھا جس نے اسے ایک بڑی اچھی ڈی بیٹر بنایا تھا۔ وہ اسے بہت پہلے سے جانتے تھے، جب وہ دونوں ابھی اتنے میں تھے اور وہ اپنے گرائز کالج کی طرف سے ایک مبائش میں شرکت کرنے کے لئے آئی تھی۔ ان دونوں میں بھی وہ سبز لباس میں تھی اور نکلتے ہوئے قد کی، بڑے خوش نما اونچے چوکور ماتھے اور بھورے بالوں والی دلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی۔ چنانچہ اس کی تقریر کے آغاز میں دونوں نے خوب ہوٹنگ کی، مگر جب ایک دفعہ اس نے ان کو ٹاک کر بڑے اعتماد سے نظر جما کر اور آنکھیں سکیٹر کر بڑے کٹیے انداز میں کوئی بات کی تو وہ بھیگی بلی کی طرح سسم کر بیٹھ گئے اور پھر نہ بولے۔ اس کے بعد کئی بار ان کا آمنا سامنا ہوا۔ چنانچہ جب وہ پہلی یونیورسٹی میں آئی تو وہ اس سے کچھ کچھ خائن رہے مگر اب وہ پہلے سال کی دلی پتلی کمزور سی لڑکی نہ تھی اب وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی اور اس کی سحرے زرد رنگ کی جلد تھی اور بڑا چوڑا

اور اونچا ماتھا تھا اور جہاں سے اس کے ہلکے رنگ کے، جڑوں سے ابھر کر نکلے ہوئے بال شروع ہوتے تھے۔ بڑی سیدھی اور ہموار لائی تھی اور وہ اپنے گھنے بالوں کو لا پروائی سے ایک دم پچھے کی طرف کنگھی کر کے ڈھیلا ڈھالا جوڑا بناتی تھی اور اسی طرح آنکھیں ہلکی سی سکیٹر کر بڑی سنجیدگی سے بات کرتی تھی اور کسی کو لفت نہ دیتی تھی۔ ان باتوں کو اور دوسری ساری حوصلہ شکن باتوں کو اور اس کی چال کی گریں کو اور اس کی شخصیت کی دل کشی کو ان دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر، الگ الگ، دیکھا اور محسوس کیا اور بڑھنے لگے۔ دور ہونے لگے۔

پسلے اس کا ذکر آپس میں بند ہوا، پھر ظزیہ جملوں پر نوبت آئی، پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ اپنے اپنے راستوں پر بڑھتے گئے۔ اس نے کہانیاں لکھیں اور تقریریں کیں اور ڈرافیاں جیتیں، مس جمال افروز انصاری کو ڈی بینگ ٹیم کا نائب لیڈر بنوایا، اس کی تصویر میگزین کے پورے صفحے پر چھاپی اور بڑا شاندار نوٹ لکھا۔ ریاض نے ہاکی ٹیم کی کپتانی سنبحاںی اور انٹرورشی چیمپئن شپ جیتی پھر اس نے اپنے باپ کے پیسے کا پورا پورا استعمال کیا۔ اس نے بڑھیا سوٹ سلوائے اور ایک چھوٹی سی کار خریدی جس پر بیٹھ کر روزانہ یونیورسٹی آنے لگا۔ دونوں مقبولیت اور کامیابی کی آخری سیڑھی پر کھڑے تھے اور سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جب ڈائیس پر چڑھ کر "مسٹر پریزیڈیٹ" آزربیل جز، لیڈر زینڈ جنٹلمنیں، کہہ چلتا تو سیدھا اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی (اپنے روشن ماتھے کو اوپر اٹھائے، آنکھیں ہلکی سی سکیٹر کر غور سے اسے دیکھتی ہوئی) اس کو ایک لختے کے لئے بڑی شدت سے دیکھتا اور نظر اٹھا لیتا اور پھر الفاظ اس کی زبان سے ایسی روانی اور قوت سے نکلتے کہ اس کا بدن اڑنے لگتا۔ پھر جب میگزین سے ماہی کی سہ ماہی چھپ کر آتا تو وہ دن بھر کنکھیوں سے اسے اس کی درق گردانی کرتے ہوئے دیکھتا اور اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ اس سے اس کا

ذکر کرتی ہے۔ اور ریاض تھا، جو ہاکی کے میدان میں ایک ”پاس“ بھی کام کارتا تو مژ کر ایک نظر ہزاروں کے گھمے میں اس سبز لباس پر ڈال لیتا، مقابلے کی کوئی دوڑ جیتا تو ہانپتا ہوا ضرور اسکے سامنے سے گزرتا، اور دن دن بھر کسی نہ کسی طرح اس کی نظر کے سامنے رہتا۔ جب ڈی بینگ ٹیم کراچی گئی تو وہ بھی ان سے الگ چھٹی لے کر وہاں پہنچا اور شوکت کی تقریر کے دوران اس نے کراچی یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر خوب ہونگ کی۔ جب ان کی ٹیم نے بہر حال مبارکہ کی ٹرافی جیت لی اور وہ لڑکے لڑکوں میں گھرے ہوئے باہر نکلے تو وہ بے انتہا مسروں جمال کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا: ”مبارک ہو جال۔“ اور جمال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دونوں دیر تک کھڑے باشیں کرتے رہے۔ اس وقت وہ وہاں سے چلا آیا تھا اور دور برآمدے میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ آخر جب وہ ریاض سے رخصت لے کر اس کے پاس پہنچی تھی تو اس نے پہلی بار بے اختیار ہو کر کہا تھا: ”کیا باتیں ہو رہی تھیں؟“ اور وہ ہنس کر بولی تھی۔

”مبارک باد و صول کر رہی تھی۔“ اور سن کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا اور حسد کا جلتا ہوا جذبہ اس کے دماغ کو جا چڑھا تھا اور وہ خفگی سے بولا تھا: ”مبارک باد میں اتنی دیر لگ گئی!“ اور پہلی بار اس نے رک کر، آنکھیں سکریٹر کر غصے سے کہا تھا: ”یہ مجھ پر کیا حق جتارہ ہے ہو شوکت!“ اور اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک اس کے قریب نہ پھٹکا تھا۔ (یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو بڑے انجانے طور سے دل کو دل شکنی کے قریب لا رہی تھیں۔)

پھر فیصلہ کن وقت وہ آیا جب اس نے اور ریاض نے یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ ان کی بول چال تقریباً بند ہو چکی تھی، مگر اعلان سے چند روز پہلے وہ ٹک شاپ سے نکل رہا تھا کہ ریاض اسے دروازے پر کھڑا ہوا مل گیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور وہاں

کھڑا شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آگے بڑھا اور پرانے پیارے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

”میں نے ساہے تم کھڑے ہو رہے ہو شو کی۔“

”ہاں۔“

”مت کھڑے ہو۔“

”کیوں؟“

”ہار جاؤ گے۔“

وہ بڑے اعتماد سے اور بڑے طنز سے ہستا تھا: ”اپنی خیر مناؤ میاں۔“ اس نے کہا تھا۔

”تمہارا کوئی چانس ہی نہیں ہے شو کی۔“

”یہ تو پتا چل جائے گا بھی۔“ اس نے بیجد آکتا کر کہا تھا۔

دونوں ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر ریاض نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ اٹھایا تھا۔

”اچھا، تمہاری مرضی۔“ وہ جاتے جاتے بولا تھا: ”مگر ایک بات یاد رکھو“

اس نے کہا تھا: ”جمال تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔“

اس کا دل بیٹھ گیا تھا مگر وہ بڑے طنز سے کھوکھلی سی نہیں کر بولا تھا:

”دیکھا جائے گا۔“

پھر گروہ بندیاں ہوئیں اور سکیمیں بنیں۔ پوسٹر چھپے اور پارٹیاں ہوئیں اور ڈھیروں کچڑا چھالی گئی۔ اسکینڈل اڑے اور نظرے لگائے گئے اور جوان اور لاپرواولوں نے خوب خوب ایک دوسرے پر دوار کئے مگر جمال کے پاس ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ گیا۔ صرف دل تھامے دونوں انتظار کرتے رہے، انتظار کرتے رہے۔ آخر اس نے خود ہی ایک روز اسے برآمدے میں روک لیا۔

”آج کل بڑا ہنگامہ ہو رہا ہے جناب۔“ وہ نہس کریوں: ”بڑے مصروف ہیں آپ!“

”نہیں تو۔“

”کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟“ اس نے انجانے پن سے پوچھا۔
”ہاہا۔“ وہ گھبرا کر نہس پڑا۔

پھر وہ سخیدہ ہو گئی: ”مجھ سے تو تم نے کہا ہی نہیں شوکت۔“
”کیا؟“

”ووٹ کا۔“

”تمہارا ووٹ۔“ جواب دیتے دیتے وہ سرخ ہو گیا تھا: ”تو میرا اپنا ہی ہے جال۔“

”اتنا اعتماد ہے تمہیں؟“ وہ بولی تھی۔

”ہاں۔“ اسے کہا تھا، اور جواب میں وہ نہس دی تھی، جیسے کہ رہی ہو:
”تو پھر ٹھیک ہے شوکی۔“ اور ریاض جیسے اسی روز ہار گیا تھا۔
جس روز وہ منتخب ہوا اس کے ساتھیوں نے اسے کندھوں پر چڑھا کر
ریاض کے کمپ کے سامنے بھنگڑہ ڈالا اور ساف کی نظرؤں کے سامنے پتلوں میں
نکال دیں اور اگر چند پروفیسر بچاؤ نہ کرتے تو شاید بلوہ ہو جاتا۔ اسی روز ریاض
یونیورسٹی سے غائب ہو گیا تھا۔

پھر وہ کبھی وہاں لوٹ کرنے آیا۔ چند روز کے بعد اسے صرف ایک خط ملا
تھا جس میں ایک جملہ لکھا تھا: ”شوکت اور جمال کو مبارک باد۔“ جسے پڑھ کروہ
خوب ہنسا تھا اور جمال اداس ہو گئی تھی۔ پھر سنائی گیا کہ وہ اپنے اخبار کالندن
کار سپاپنڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسی سال شوکت نے فرست کلاس فرست رہ کر امتحان
پاس کیا اور اگلے سال چانسلر کے ہاتھ سے گولڈ میڈل وصول کیا اور پھر ان کی

شادی ہو گئی۔ چند ہی برس کے اندر وہ اپنے شرکا سب سے مشہور اور بھاری معاوضہ پانے والا فری لائس جرنلٹ بن گیا۔ پھر وہ نئی دنیاوں اور نئی کامرانیوں کی تلاش میں اس شرکو ہجرت کر آئے۔ جہاں دو منزلہ بسیں چند ایک تھیں اور صرف خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد تک وہ بہت خوش رہے تھے۔ بہت ہی خوش رہے تھے۔ فتح و کامرانی کے ان آفاق کا نام اب ماضی تھا جس کے سنبھالے زرور نگ کو یاد کرتے کرتے اب وہ سوچلا تھا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور جمال ابھی نہ لوٹی تھی۔ اس نے انہ کر کپڑے پہنے، جمال کے اپنی کیس سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ پیسے نکالے اور انہیں جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ فٹ پاتھ پر اترتے ہی دوپر کی تیز دھوپ اس کی آنکھوں کو لگی اور اس نے ہاتھ سے ان پر سایہ کر لیا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے وہ دور تک چلتا گیا، پھر ایک چورا ہے پر رک کر اس نے ہاتھ اٹھایا اور کئی بار آنکھوں کو جھپک کر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف کو چل پڑا تھوڑی دیر کے بعد وہ ساحل سمندر پر نکل آیا۔ ساحل پر کئی لوگ گھوم رہے تھے۔ اس نے کچھ لوگوں کو غور سے اور کچھ کو سرسری طور سے دیکھا اور ادھر ادھر پھر تارہا۔ پھر وہ ریستوران میں جا کر سمندر کے رخ کھلنے والی کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ باہر یتیلے ساحل پر اور سطح سمندر پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر فضا کا وہ گمراگد لا نیلا سار نگ، جواب ہر طرف چھایا رہتا تھا، بدستور موجود تھا۔ اسی ہی رنگ کی بھاری نمدار ہوا، جس میں سمندر کی مخصوص بورچی ہوئی تھی، ڈائینگ ہال کے آر پار چل رہی تھی۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے دیر تک بیٹھا تکشکی باندھے باہر کے منظر کو دیکھتا اور چھاتی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ اندر ہال میں اب لوگ آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے تھے اور کھانا لایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بیسپی رہے تھے۔

ہال کے دروازے پر سلیم، جو اس کا شاعر دوست تھا، اپنی بیوی جیلہ اور ایک دوست کریم بھائی کے ہمراہ نمودار ہوا۔ (افواہ تھی کہ کریم بھائی آج کل اسے سپورٹ کر رہا تھا) وہ تینوں ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے آکر اس کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

”ہلو شوکی۔“ سلیم نے کہا۔

”ہلو“ وہ چونک پڑا: ”ہلو ہلو۔“

”کہاں چھپے رہے اتنے روز تک؟“

”ملک عدن کی سیر کو گیا تھا۔“ وہ بولا ”صحت بنارہا تھا۔“

”ایں؟ اچھا ان سے ملو، کریم بھائی کراچی والا۔“ سلیم نے تعارف کرایا: ”کریم بھائی یہ میرا دوست ہے شوکت محمود۔ ملک کا سب سے بڑا خبر نویس۔“

”پیپرو والا؟“ کریم بھائی نے پوچھا: ”جرنلٹ؟“

”ہاں، پیپرو والا جرنلٹ۔“ ادھیڑ عمر، غیر دلچسپ حلئے والا بوہرہ منہ کھول کر ہنسا: ”ویری گریٹ جرنلٹ۔“ وہ اس وقت خاصاً مدھوش تھا۔ پسلے دو چار بار اس نے قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کو متوجہ کرنے کی کوشش کی، پھر ایک دم جھنجھلا کر زور زور سے میز پر ہاتھ مارنے لگا۔

”سالا کیا گڑ بڑ ہے ادھر؟“ وہ چیخا: ”بیرا——“

بیرے کو اس نے تین بیسرا اور ایک لامب جوس کا آرڈر دیا۔

”میں کھانا کھاؤں گا۔“ شوکت نے کہا۔

”کھانا بھی کھائے گا۔“ وہ بولا: ”سالا وہ بھی کھائے گا بعد میں۔“

”ویری گریٹ سالا۔“ شوکت نے اس کے کندھے پر دھڑ جمایا: ”ہاں

۔۔۔

بیرا جب آرڈر لے کر آیا تو کریم بھائی نے بیر کا مگ اٹھا کر منہ سے لگایا

اور غث غث پینے لگا۔ شوکت اور سلیم اپنے مگوں کو تھامے بیٹھے رہے۔ جمیلہ لامِ جوس کے چھوٹے گھونٹوں کے درمیان گری نظرؤں سے شوکت کو دیکھتی رہی۔

”ایک عرصے سے تمہارا نام نہیں دیکھا۔“ سلیم نے کہا۔
ایک عرصے سے میں نے بھی اپنا نام نہیں دیکھا۔“ وہ بولا：“حیرت ہے۔“

”لکھتے کیوں نہیں؟“
”کیا لکھوں؟“ اس نے معصومیت سے سوال کیا۔
”سala سوب گھپلا ہے ادھر۔“ کریم بھائی پھر زور زور سے میز پر کے مارنے لگا：“بیرا——
بیرا کریم بھائی کامگ دوبارہ بھر کر لے آیا۔ سلیم آہستہ سے (”با“ کر کے جیسے کتا کبھی کبھی بے خیالی میں مختصری آواز نکالتا ہے) ہنسا۔
”میں نے ایک نظم لکھی ہے۔“ اس نے کہا۔
”نظم لکھنا بھی بڑا مفید ہوتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحت بنانا۔ مبارک ہو۔“

”سala سوب مر گیا ادھر۔“ کریم بھائی پھر میز بجانے اور شور مچانے لگا:
”سوب مر گیا، سوب مر گیا سala۔“ یہاں تک کہ بیرا بھاگتا ہوا آیا اور بھرا ہوا مگ اس کے سامنے رکھ گیا۔

”یہ دارالخلافے کا کیا چکر ہے؟“ سلیم نے پوچھا۔
دارالخلافے کو پسے لگائے جا رہے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ایں؟“
”پسے لگ جانے کے بعد پڑوں ڈال کر ہانکا جائے گا اور ملک عدن کو لے

جايا جائے گا۔“

”تم اب لکھتے کیوں نہیں شوکی؟“

میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ بولا: ”حرمت کی بات ہے۔“

”تمہاری وہ عجیب و غریب دلچسپ سکینڈ لس تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔“

”سلیم۔“ وہ پہلی بار سنجیدگی سے دلچسپی لے کر بولا: ”مجھے اپنی نظم سناؤ۔“

سلیم ہنسا: ”بس ایسی ہی ہے۔“

”نہیں سناؤ۔“

سلیم نے کھانس کر گلا صاف کیا اور ایک منٹ تک فضا میں دیکھتا رہا: ”تو فلک فلک کا والی——“ پھر اس نے نرم آواز میں کہنا شروع کیا: ”تو فلک فلک کا والی، میں زمین زمین کا مولا——“ دیر تک وہ اپنی آواز میں کھویا ہوا نظم سناتا رہا۔

نظم سنتے ہوئے اس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا اور وہ باہر کے منظر کو تقریباً بھول گیا۔ جب نظم ختم ہوئی اور کسم بھائی نے پھر شور مچانا شروع کیا تو اس کا چہرہ پھر بے رنگ ہو گیا اور سیاہ مالع آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ باہر دیکھنے لگا۔ کانچ کی سی ٹھہری ہوئی نظروں سے وہ کھڑکی سے باہر نیلے ریتلے ساحل پر بھڑکیلے پھول دار لباسوں اور چمکیلے سفید بدنوں اور سیاہ چشموں اور چوڑے چوڑے ربنوں والے ہیٹوں کو دیکھتا رہا۔ سب خاموش بیٹھے بیترپیتے رہے۔ پھر سلیم اپنی جگہ پر کسما یا۔

”شوکت:“ وہ آگے جھک کر بے چینی سے بولا: ”کیا کر رہے ہو آج کل؟“

”کچھ نہیں۔“

”لکھتے کیوں نہیں؟“

”کیا لکھوں؟“ اس نے کہا: ”اب کیا لکھوں؟“

چاروں غاموش بیٹھے رہے۔ کرم بھائی اب آدمی بیز پیتا اور آدمی کپڑوں پر گراتا جا رہا تھا۔ جمیلہ نے اپنا گلاس میز کے وسط میں دھکیل دیا۔

”بڑا خوش گواردن ہے۔“ سلیم نے اداسی سے دوہرا یا۔

پھر انہوں نے چونک کر شوکت کو دیکھا جس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا تھا۔ وہ چمکتی ہوئی مسرور آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”تم نے ”دن“ پڑھا ہے؟“ اس نے کہا۔

”ایں؟“

”بڑی نازک چیز ہے۔“

”کیا؟“

”دن۔“

”دن کیا؟“

”وہ ناولٹ!“ اس نے مختصر کہا۔

سلیم اور جمیلہ انجان نظریوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پھر ٹھہری ہوئی سختی ابھر آئی اور وہ باہر دیکھنے لگا جہاں فضا کا گدانا نیلا رنگ تھا۔

ہال کے وسط میں ایک بیرے کے ہاتھ سے پانی کا بھرا ہوا شیشے کا جگ پھسل کر گرا اور ٹوٹ کر دور دور بکھر گیا۔ ”غصتا“ کرم بھائی اپنے گک پر منہ رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ سلیم بڑے اطمینان سے میز پر کھنیاں رکھے چند لمحے تک اسے گک میں منہ ڈال کر روتے اور بڑا تھے ہوئے (”سالا ایک دم گھپلا کر

ریا — سالا ڈوب کر دیا میرے پرنس کو — سالا میرے پرنس کو ہو ہو ہو
— ”) دیکھتا رہا، پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا: ”چلو۔“
کریم بھائی مگ کو منہ سے چپکائے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ
چل پڑا۔

”چلو۔“ سلیم نے جمیلہ سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی میز پر انگلیاں بجائی
رہی۔

”بیس بیٹھو گی؟“

”ہاں۔“

”اچھا شوکی — پھر ملاقات ہو گی۔“ سلیم آہستہ سے ہنسا: ”میری
بیوی کا خیال رکھنا۔ اسے تم سے عشق ہے۔“ وہ روتے ہوئے کریم بھائی کو بازو
سے پکڑ کر چلاتا ہوا کاؤنٹر کی طرف لے چلا۔

شوکت نے ٹھہری ہوئی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

”پرنس کو آج گولی مار دی گئی۔“ وہ بولی۔

”پرنس؟“

”کریم بھائی کا بہترین گھوڑا تھا۔“ وہ میز پر جھک کر بیٹھ گئی: ”آج ریس
میں لید کر رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کی دونوں اگلی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔
انہوں نے اسی وقت اس کے دماغ میں گولی مار دی۔ بڑا خوبصورت حانور تھا۔

وہ کرسی سے نیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر ہلاکا سارنگ جھلک
آیا۔ ایک بڑا واضح اور روشن منظر وہ تھا جب وہ ہائی سکول میں تھا اور صبح صبح
سائیکل پر سوار سکول کو جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک خوب رو جوان ایک منہ زور
گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا، چاروں پاؤں پر اسے بھگاتا ہوا نمودار ہوا۔ سڑک
کے چوک میں پہنچ کر گھوڑا دفعتا ”ہنسنا یا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اس

کے نعل ٹھکے سم ہوا میں کپکپانے لگے۔ اس نے سرک کے کنارے اپنی سائکل روک لی اور ایک پاؤں زمین پر نکا کر دیکھنے لگا۔ سوار کے چہرے پر ہر اس کا نام تک نہ تھا۔ وہ دانت پیس کرو حشیانہ قوت کی خوشی کے زیر اثر جیسے ہنس رہا تھا اور رکابوں پر اٹھا، باغوں سے لٹکا ہوا جیسے گھوڑے سے کشتی لڑ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کو قابو میں کر لیا۔ گھوڑے نے اگلے پاؤں زمین پر لا رکھے اور زور سے ہنہنایا اور صبح کی زرد ھوپ میں گرد کے لاکھوں ذرات اڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگ گیا۔ گھوڑے کے کوچ کے اس منظر میں کوئی خاص بات نہ تھی، مگر اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے (کھڑکی سے باہر گد لے نیلے رنگ کو چاروں طرف سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر) اس کو اس سفید براق گھوڑے کی چوڑی، پلی ہوئی پیٹھ کی اور اس پر بڑے اعتماد اور توازن سے جم کر بیٹھے ہوئے اور اس کی اڑان کے ساتھ اڑتے ہوئے سوار کی بڑی واضح اور روشن یاد آئی کہ دل اس زمانے میں بڑا شہ زور اور تنخ پا اسپ تازی تھا۔

اب سلیم بڑی کوشش کے بعد بیڑ کے گک کو کریم بھائی کے منہ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر وہ بل ادا کر کے اسے بازو سے پکڑے پکڑے باہر نکل گیا۔

”کیا پیو گی فاختہ؟“ شوکت نے پوچھا۔

”لام جوس۔“

شوکت نے بیڑے کو اپنے لیے کھانا اور جملہ کے لیے ایک اور لام جوس لانے کا آرڈر دیا۔

جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو جملہ نے اپنے گلاں سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور آگے جھک کر بیٹھ گئی۔

”شوکی“ اس نے کہا ”تم ریاض سے ملے تھے؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

وہ خاموش اور تنڈی سے کھاتا رہا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا شوکی۔“

”کیا؟“

”کہ ایک بار اس سے ضرور ملوگ۔“

اس نے ناچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا: ”کب کیا تھا؟“

”کیا کیا تھا!“ وہ ہاتھ جھٹک کر مایوسی اور بے یقینی سے بولی: ”ایک ہفتہ

پہلے کی بات کو تم بھول بھی گئے ہو؟“

”نہیں تو۔“

”اوہ شوکی۔“ وہ مایوسی سے سرہلا کر بولی: ”اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے

“ہو۔“

”جھوٹ بولنا کوئی مشکل کام نہیں!“ وہ دوبارہ کھانے لگا۔

”شوکی——“ جمیلہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی: ”چلو مان لیا کہ تم

نے—— میری بات سنو شوکت۔“

”سن رہا ہوں فاختہ۔“

”ایک بار تو کم از کم——“ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے کو

چھوا: ”کم از کم بات تو کر کے دیکھو مجھے یقین ہے کہ تم اسے راضی کر سکتے ہو۔

صرف ایک بار شوکی۔“ وہ بولی: ”میری خاطر۔“

”تمہاری خاطر میں کیا کیا کرتا پھر وہ بھی؟“

”میری خاطر!“ وہ پھٹ پڑی: ”میری خاطر تم نے کیا کیا ہے؟ میں کیا کیا

ہے؟ کبھی بھی۔“

وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک اور سترے زورنگ کا چہرہ تھا جو جی کو اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی سال تک کالج اور یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ رہے تھے اور اس لڑکی نے ٹوٹ کر اس سے محبت کی تھی مگر کبھی منہ سے نہ بولی تھی۔ (وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو چپکے ہی چپکے محبت کر کے اپنی تکمیل کر لیتی ہیں اور پھر عمر بھرا سی قوت کے سمارے خوش رہتی ہیں) وہ سب جانتا تھا مگر کبھی اس کی طرف راغب نہ ہوا تھا کہ اس لڑکی میں اس کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اب اس کا اجلے زورنگ کا چہرہ جی کو بڑا اچھا لگتا تھا بہر حال۔ وہ کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا：“اچھا” اس نے تھکے ہوئے لبجے میں کہا：“چلو۔”
وہ باہر نکل آئے۔

”شوکی“ فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولی：“
بھئی آہستہ چلو۔”

تحوڑی دیر کے بعد وہ ”روزنامہ —“ کی سات منزلہ مہیب عمارت میں داخل ہوئے۔ وسیع ہال میں ہر طرف اخباروں کے ترتیب وار ڈھیر لگے ہوئے تھے اور پیکر لڑکے پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہوئے انہیں چھوٹے چھوٹے بندلوں میں باندھ رہے تھے۔ تھہ خانے سے پرلیس کی مشینوں کے چلنے کی گڑگڑا ہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سب جگہ پرنیوز پرنٹ کی مخصوص بورکی ہوئی تھی۔ وہ لفت پر سوار ہو کر چوٹھی منزل پر جا اترے۔ برآمدوں اور گیلریوں میں چشمیں والے مرد بربیف کیس اٹھائے اور ہر ادھر آ جا رہے تھے، کھڑے باتیں کر رہے تھے اور پیٹنہ پوچھ رہے تھے۔

”ہلو سر۔“ ایک رپورٹر اپنے ساتھی سے باتیں کرنا چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

”ہلو۔“ وہ نا آشنا نظروں سے اسے ریکھتا ہوا آگے نکل گیا۔

”کون ہے؟“ رپورٹر کے ساتھی نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے؟“ وہ حیران ہو کر بولا: ”شوکت محمود۔“

”ارے!“ دوسرا رپورٹر چونک پڑا۔ ”تو یہ شوکت محمود ہے۔“

”ہاں، جدید رپورٹنگ کا بانی۔“ پہلا طنز سے ہنسا: ”غور سے آسمان پر چڑھتا جا رہا ہے۔“

”مگر انور۔“ دوسرا نے کہا: ”تم نے اس کی بنگال کی رپورٹیں پڑھی ہیں؟“

”ارے ہاں بھئی۔“ انور نے اکتا کر کہا: ”بہت کچھ پڑھا ہے۔“

”بڑے عرصے سے میری اس سے ملنے کی خواہش ہے۔“ دوسرا نے کہا: ”اب بہت کم لکھتا ہے مگر۔“

”اب بڑا آدمی بن گیا ہے۔“

”یہ اس کی بیوی ہے؟“

”ارے نہیں بھئی، اس کی بیوی تو“ انور نے انگوٹھا اور درمیانی انگلی ملا کر، ایک آنکھ بھیچ کر ہلکی سی سیٹی بجائی: ”اے ون ہے، اے ون!“

وہ جمیلہ کے ساتھ چلتا ہوا اس دروازے کے سامنے جا رکا جس پر

”میجنگ ڈائریکٹر“ کا بورڈ لگا تھا۔

”چلو۔“ اس نے کہا۔

”نهیں تم جاؤ“ میں اس کی سیکرٹری کے پاس بیٹھی ہوں۔ اور شوکی“ وہ ملت جیانہ لجئے میں بولی: ”پورے دل سے کوشش کرنا، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”وی فار و کٹری۔“ اس نے کہا اور دروازہ کھول کر ریاض کے ایئر کنڈیشنڈ

دفتر میں داخل ہوا۔ ریاض میز پر جھکا، سیاہ فریم کا پڑھنے والا چشمہ لگائے سفید
کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ہلو۔“ ریاض نے سراٹھا کر اسے دیکھا اور چشمہ اتار کر میز کے شیشے پر
رکھ دیا۔ پھر اس نے کرسی سے نیک لگا کر لمبا سانس چھوڑا اور اپنا سیت سے بولا:
”ہلو شوکی۔“

”ہلو ریاض۔“ اس کی بے مقصد نظرؤں نے آفس کی دیواروں کا جائزہ لیا
جمال بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں لٹک رہی تھیں۔

”بہت دنوں کے بعد نظر آئے ہو۔“ ریاض نے کہا۔

”تم بھی تو دکھائی نہیں دیئے۔“

”ہاہا۔“ ریاض ہنسا: ”میں تو یہیں پر تھا۔“

”ہاہا، گو میں بھی یہیں تھا۔“

ریاض نے بڑی فراغت سے پائپ میں تمباکو بھرا اور اسے سلگا کر ہلکے کش لینے لگا۔

”کیسے رہے؟“ پھر اس نے پوچھا۔

”اے ون۔“ اس نے کہا۔

”جال آئی تھی۔“

”کب؟“

”آج سوریے۔“ ریاض نے کہا: ”اے سروس مل گئی ہے۔“

”کہاں؟“

”وہاں کالج میں۔“

”کچھ دبلے نظر آرہے ہو ریاض۔“

”میں؟“ ریاض ہلکی سی پریشانی سے ہنسا: ”نہیں تو۔ ذرا کام کا بذریعہ رہا۔“

پچھلے دنوں۔“

”بہت محنت کرنے لگے ہو۔“

”ہاہ۔“

”ریاض——“ وہ کرسی پر کھسایا اور میز پر کھنیاں رکھ کر بیٹھ گیا۔

”کم سے شروع کر رہی ہے۔“ ریاض نے کہا: ”گوا بھی عارضی طور پر

“_____

”ریاض“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، ”میں کام کے لئے آیا تھا۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے، آنکھ جھپکے بغیر ریاض کی نظریں جیسے بہت دور اندر کو سست گئیں۔ وہ دیوار پر لٹکی ہوئی ایک پینٹنگ کو گھورنے لگا۔

”یہ پینٹنگ میں نے صادقین سے آج ہی خریدی ہے۔“ اس نے کہا:

”کیسی ہے؟“

”اے ون۔“

ریاض اٹھ کھڑا ہوا: ”اب میں اس سے میور لز بنوارہا ہوں یہاں۔“ اس

نے دائیں بازو کی دیوار کی طرف اشارہ کیا: ”کیا خیال ہے؟“

”ریاض“ وہ جلدی سے کھڑا ہوتا ہوا بولا: ”میں کام کی تلاش میں آیا

ہوں۔“

”کام؟“ ریاض نے جیسے پہلی بار سنا اور وہ چونک کر ہنسا۔ ”بیٹھ جاؤ شوکی۔ کام کی تمہیں کمی ہے؟“ وہ چپکے سے بیٹھ گیا۔

”تم تو بڑے نامور آدمی ہو۔“ ریاض پھر بولا: ”تمہارے قلم کی تو بڑی قیمت ہے۔— یا کم از کم ہوا کرتی تھی۔“

”قیمت مائی فٹ۔“ اس نے کہا: ”صرف تمہارے اخبار میں تھوڑی سی